تدریسِ قرآن میں احادیث سے استفادہ
منہج وطریقۂ کار

——— مولانا مفتی جمیل احمد نذیری

قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب ہے، جو خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے نازل کرنے کے بعد یونہی نہیں چھوڑ دیا کہ اُسے جو چاہے پڑھے، اور جس آیت کا جو چاہے مطلب نکال لے، بلکہ ساتھ ہی اپنے رسول پر یہ ذمہ داری بھی ڈالی کہ آپ انسانوں کے سامنے اس کے معانی کی وضاحت کردیں۔ فرمایا:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ (النحل:۴۴)

ہم نے آپ پر یہ قرآن اتارا ہے، تاکہ جو چیزیں لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہیں، آپ انھیں ان لوگوں کے لیے بیان کردیں۔

آں حضرت ﷺ نے اس فرض کو بہ خوبی سرانجام دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ۔ (البقرۃ:۱۵۱)

جس طرح تم لوگوں میں ایک عظیم الشان رسول بھیجا تم ہی میں سے، جو ہماری آیات تمھارے سامنے تلاوت کرتے ہیں اور تمھیں پاک کرتے ہیں اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور تم کو ایسی مفید باتیں سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

[مزید ملاحظہ کیجیے آل عمران:۱۶۴، الجمعۃ:۲]

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرآن کے 'مبیّن' (وضاحت

کرنے والے) ہیں۔قرآن کریم کی تبیین وتوضیح آپؐ کے ذریعہ کس طرح ہوئی، اس کی دوشکلیں ہیں: ایک تلاوت آیات، دوسری تعلیمِ کتاب۔ 'تلاوت آیات' تو ایک واضح چیز ہے، لیکن 'تعلیم کتاب' سے کیا مراد ہے؟۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر 'تعلیم کتاب' سے مراد بھی کلماتِ قرآنی کو پڑھ کر سنانا اور یاد کرانا ہوتو یہ 'تلاوتِ آیات' سے الگ چیز نہ ہوئی، لیکن جب اسے الگ سے بیان کیا گیا ہےتو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اول الذکر سے الگ چیز ہے۔ لہٰذا یقینی طور پر اس سے مراد آیات کی تشریح، اس کے معانی ومطالب کی توضیح اوراس کے احکام کا بیان ہوا۔

'تلاوتِ آیات' کیسے ہوگی اور تعلیم کتاب کیسے؟ یہ سب 'تبیینِ قرآن' میں داخل ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہم 'سنت' یا 'احادیثِ کریمہ' کے مجموعے سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیوں کہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اورتقریرات کا نام ہے۔[۱]

قرآن صرف تلاوتِ آیات کا حکم دیتا ہے، اس کی کیفیت نہیں بتاتا۔ سوال یہ ہے کہ جیسے تیسے آیاتِ قرآنی پڑھ دینے کا نام 'تلاوتِ آیات' ہے، یا اس کا کوئی مخصوص اسلوب اورطریقہ ہے؟ یہ چیز ہمیں رسول اللہ ﷺ کے 'بیان' سے معلوم ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے:

ان ھذا القرآن انزل علیٰ سبعة احرف فاقرء وا ما تیسّر منه۔[۲]

یہ قرآن سات حرفوں (قرأتوں) پر اتارا گیا ہے، تمھیں اس میں سے جوآسان ہو، وہ پڑھو۔

دوسری روایت میں ہے:

أقرأني جبرئیل علیٰ حرف فراجعته فلم أزل استزیده ویزیدني حتی انتھیٰ الیٰ سبعة احرف۔[۳]

جبرئیل نے مجھے ایک حرف (قرأت) پر قرآن پڑھایا، پس میں نے ان سے مراجعت کی اور برابر زیادہ مانگتا رہا اور وہ زیادہ کرتے رہے، یہاں تک کہ سات حرفوں (قرأتوں) تک پہنچے۔

'سات حروف' سے مراد خواہ سات قراءتیں ہوں یا سات لغات[۴]۔ بہرحال

نبی کریم ﷺ کے 'بیان' سے ظاہر ہو گیا کہ 'تلاوت آیات' سے مراد عامیانہ یا سادہ انداز میں قرآن پڑھنا نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی ایک خاص اسلوب اور طریقہ ہے۔ درج ذیل احادیث بھی 'تلاوتِ آیات' کے مخصوص اسلوب پر دلالت کرتی ہیں:

عن قتادة قال سئل انس کیف کانت قرأة النبی ﷺ فقال کانت مدّا ثم قرأ بسم الله الرحمن الرحیم یمدّ ببسم الله، ویمدّ بالرحمٰن، ویمدّ بالرحیم۔۵

حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی قرأت کیسی تھی؟ کہا: لمبی قرأت تھی، پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی، بسم اللہ کے ساتھ آواز لمبی کی، پھر رحمٰن کے ساتھ آواز لمبی کی، پھر رحیم کے ساتھ آواز لمبی کی۔

عن حذیفة قال قال رسول الله ﷺ اقرء وا القراٰن بلحون العرب وأصواتها وایّاکم ولحون أهل العشق ولحون أهل الکتابین۔۶

حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن کو عربوں کے طریقے اور ان کے لہجے میں پڑھو۔ اور عشق والوں کے طریقے اور دونوں اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے طریقے سے بچو۔

جب رسول اللہ ﷺ مشرکین کے سامنے 'تلاوت آیات' کرتے تھے تو اس کے مضامین، اس کی عربیت، اس کی بلاغت اور اس کی بلند آہنگی کے علاوہ، خود اس کا طریقۂ ادا، طرزِ ادا اور اندازِ تلاوت بھی مشرکین کو متاثر کرتا تھا۔

مرادِ قرآنی تک پہنچنا صرف کتبِ لغت اور کلام عرب سے ممکن نہیں

کتبِ لغت، کلامِ عرب اور جاہلی ادب وغیرہ کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن قرآن کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن کی مراد تک صرف ان کے سہارے نہیں پہنچا جا سکتا۔ کسی لفظ یا جملہ کا لغوی معنیٰ ایک چیز ہے اور اس کی اصل مراد دوسری چیز ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۔(البقرۃ:۱۸۷)

کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ تمھیں صبح کا سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے ممتاز ہو جائے۔

لغت کی رُو سے **الخیط الابیض** (سفید دھاگا) اور **الخیط الاسود** (سیاہ دھاگا) کا بالکل واضح اور صاف مفہوم ہے، مگر آیت میں یہ مراد نہیں ہے۔ حضرت عدیؓ بن حاتم، جو خود اہلِ زبان تھے، رسول اللہ ﷺ سے اس کا مطلب دریافت کرنے پر مجبور ہوئے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

لا بل هو سواد الليل و بياض النهار ۔[۷]

(اس سے سفید اور سیاہ دھاگے مراد نہیں ہیں) بلکہ رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہی ایک اور آیت ہے:

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبٰوا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔(البقرۃ:۲۷۵)

جو لوگ 'ربا' کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں گے قیامت میں قبروں سے مگر اس طرح، جیسے کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جسے شیطان لپٹ کر خبطی بنادے (یعنی حیران و مدہوش) یہ سزا اس لیے ہوگی کہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ 'بیع' بھی مثل 'ربا' کے ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے 'بیع' کو حلال فرمایا ہے اور 'ربا' کو حرام کر دیا ہے۔

'ربا' کے لغوی معنیٰ 'زیادتی' کے ہیں، خواہ وہ کسی قسم کی ہو، خود بیع کا مقصد بھی اپنی ملکیت میں اضافہ کرنا ہی ہوتا ہے، ایسی صورت میں 'ربا' میں وہ بیوع بھی داخل ہیں جو شرعی مفہوم میں ربا پر مشتمل ہوتی ہیں اور وہ بیوع بھی جو شرعاً 'ربا' پر مشتمل نہیں ہوتیں، اگر کوئی چاہے کہ اس آیت کی مراد تک کتبِ لغت اور کلامِ عرب کی مدد سے پہنچے تو یہ ناممکن ہے، اس کے لیے تو اس ذاتِ گرامی کا 'بیان' چاہیے جس پر قرآن نازل ہوا تھا، وہ بیان یوں ہے:

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الذهب بالذهب و الفضة بالفضة والبرّ بالبرّ والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يداً بيد، فمن زاد او استزاد فقد أربیٰ، الأخذ والمعطی فيه سواء ۔۸ے

سونا، سونے کے بدلے، چاندی، چاندی کے بدلے، گیہوں، گیہوں کے بدلے، جو، جو کے بدلے، کھجور، کھجور کے بدلے، نمک، نمک کے بدلے، برابر برابر، دست بدست بیچا جائے۔ اور جس نے زیادہ دیا، یا زیادہ طلب کیا وہ سود میں مبتلا ہوگیا، لینے والا اور دینے والا سب اس میں برابر ہیں۔

اس حدیث میں جن چھ چیزوں کا تذکرہ ہے ان میں کچھ تولی جاتی ہیں اور کچھ ناپی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں اگر ایک دوسرے سے بیچی جائیں تو برابر برابر ہونی چاہئیں اور دونوں پر فوراً قبضہ ہونا چاہیے۔ اس میں زیادہ کرنا یا زیادتی کا مطالبہ کرنا ربا ہے۔ گویا آیتِ کریمہ میں مطلق زیادتی مراد نہیں ہے، بلکہ مخصوص اشیاء میں مخصوص قسم کی زیادتی مراد ہے، جو ربا کہلاتی ہے۔

مرادِ قرآنی ایک چیز ہے اور بلاغتِ قرآنی دوسری چیز

اسی طرح کچھ حضرات دو چیزوں کو گڈمڈ کردیتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہے مرادِ قرآنی معلوم کرنا اور دوسری ہے وجوہِ اعجازِ قرآنی پر مطلع ہونا۔ آیاتِ قرآنی سے مراد کیا ہے؟ یہ ایک چیز ہے، اور ان آیات میں وجوہِ اعجاز کیا ہیں؟ یہ دوسری چیز ہے۔ اوپر جو دو مثالیں دی گئی ہیں اگر ان میں وجوہِ اعجاز نہ معلوم کیے جائیں اور اصولِ بلاغت (معانی، بیان، بدیع وغیرہ) سے کوئی بحث نہ کی جائے تب بھی رسول اللہ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ سے دونوں آیتوں کی مراد متعین ہوجاتی ہے۔ وصل، فصل، قصر، خطاب، التفات، ذکر، حذف، ابدال، خبر، انشاء، تقدیم، تاخیر، شرط، جزاء، عطف، حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ، تشبیہ، ابہام، ایضاح، تعمیم، تخصیص، ایجاز، اطناب، مساوات، فواصل وغیرہ کا تعلق علمِ بلاغت سے ہے۔ اس سے قرآن مجید کے وجوہ اعجاز کا پتا چلتا ہے۔ کلامِ عرب، خصوصاً

ادبِ جاہلی پر نظر رکھنے والا وجوہِ اعجاز پر پوری بصیرت کے ساتھ گفتگو کرسکتا ہے، لیکن مرادِ قرآنی تک ان کے بغیر بھی پہنچنا ممکن ہے۔ البتہ حدیث کو نظر انداز کرکے بسا اوقات مراد قرآنی تک پہنچنا ناممکن ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جن پانچ علوم کو نزولِ قرآن کا اصل مقصد و منشا قرار دیا ہے، ان کا حصول اور ان میں مہارت و بصیرت بھی مذکورہ اصولِ بلاغت پر منحصر نہیں۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید کے صریح مضامین پانچ علوم سے باہر نہیں نکلتے:

(۱) علم الاحکام: احکام سے مراد واجب، مندوب، مباح، مکروہ اور حرام ہے۔ خواہ وہ عبادات کے قبیل سے ہوں یا معاملات کے قبیل سے، یا تدبیر منزل سے، یا سیاستِ مدنیہ سے، اور اس علم کی تفصیل بیان کرنا فقیہ کے ذمہ ہے۔

(۲) علم الجدل: اور وہ چار گم راہ فرقوں کے ساتھ مباحثہ کرنا ہے، یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین۔ اس علم کی مکمل وضاحت متکلم کی ذمہ داری ہے۔

(۳) علم التذکیر بآلاء اللہ: اور وہ آسمان و زمین کی پیدائش کا بیان ہے، اسی طرح بندے جن چیزوں کے محتاج ہیں ان کو دل میں ڈالنے کا بیان، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کی وضاحت۔

(۴) علم التذکیر بایام اللہ: اور وہ ان واقعات کی وضاحت ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے، فرماں بردار بندوں کو نوازنے اور نافرمانوں کو سزا دینے کے قبیل سے ظہور پذیر فرمایا:

(۵) علم التذکیر بالموت و مابعدہ: یعنی موت، حشر و نشر، حساب، میزان اور جنت و دوزخ کا بیان۔

آخری تینوں علوم کی تشریح اور ان علوم سے تعلق رکھنے والی احادیث و آثار کو ذکر کرنا واعظ اور مذکّر کی ذمہ داری ہے''۔[۹]

یہ پانچوں علوم اپنی تشریح و توضیح میں علم بلاغت کے محتاج نہیں ہیں۔ لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان میں گہرائی و گیرائی اور ان پر علیٰ وجہ البصیرۃ گفتگو کے لیے قدم قدم پر حدیث کی ضرورت پڑے گی۔

تفسیرِ قرآن کا صحیح طریقہ

تفسیرِ قرآن کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں دوسری آیات کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے اور یہ بھی تلاش کیا جائے کہ اس کے متعلق احادیث و آثار ہیں یا نہیں؟ اگر ہوں تو انھیں بھی دیکھا جائے۔ تعارض کی صورت میں تطبیق و تاویل کی کوشش کی جائے، ورنہ قرآن کو حدیث پر مقدم رکھا جائے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ قرآن کی تفسیر میں صرف قرآن پر اکتفا کیا جائے اور احادیث و آثار کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے، خواہ وہ آیت کے موافق ہوں یا ظاہراً مخالف۔ ایک مومن کی دلی خواہش ہونی چاہیے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اس آیت کے سیاق و سباق میں نبی اکرم ﷺ نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔

قرآن کی تفسیر کرتے وقت احادیث و آثار کی طرف نہ دیکھنا درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی 'مبیّنِ قرآن' کی حیثیت کو نظر انداز کر دینا ہے۔ دوسری خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ حدیث کے ظاہراً مخالفِ قرآن ہونے کی صورت میں اس کی تاویل و توجیہ نہ کرنے یا اس کے ردّ و قبول کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرنے سے یہ ذہن بنے گا کہ حدیثِ صحیح قرآن کے مخالف بھی ہوتی ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں اگر احادیث و آثار ہوں تو انھیں دیکھا جائے۔

پورا قرآن تواتر سے ثابت ہے، لیکن تواتر سے ثابت ہونے والی احادیث بہت ہی کم ہیں۔ اس لیے راویوں کی تعداد اور ان کے حالات کے اعتبار سے احادیث کی درجہ بندی ہوگی اور اسی اعتبار سے ان سے استدلال و استنباط کی بنیاد رکھنا ہوگی۔

بسا اوقات حدیث کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا

تدریسِ قرآن میں احادیث سے استفادہ ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر

بسا اوقات قرآن کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔

قرآن میں کیا ہے؟ اس کی تفصیل ہمیں حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

نزل القراٰن علیٰ خمسة أوجه: حلال و حرام و محکم و متشابه و أمثال، فاحلّوا الحلال وحرموا الحرام واعملوا بالمحکم و اٰمنوا بالمتشابه واعتبروا بالأمثال۔۱۰	قرآن پانچ وجہوں پر نازل کیا گیا ہے: حلال، حرام، محکم، متشابہ، امثال۔ پس حلال کو حلال سمجھو، حرام کو حرام سمجھو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال سے عبرت حاصل کرو۔

پھر اسبابِ نزول کی معرفت احادیث کی معرفت پر موقوف ہے۔ کیفیت نزول، شانِ نزول، سب کا تذکرہ حدیث میں ملتا ہے۔ بعض آیات و الفاظ کی تشریح خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تک رسائی بھی حدیث سے استفادہ پر موقوف ہے۔ بعض آیات میں عہدِ نبوی میں پیش آمدہ بعض واقعات وحوادث کی طرف اشارہ ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے بھی احادیث سے استفادہ ضروری ہے، علامہ زرقانیؒ نے لکھا ہے:

سبب النزول هو ما نزلت الاٰية اوالاٰيات متحدثة عنه او بينة لحكمه ايّام وقوعه والمعنىٰ انه حادثة وقعت فى زمن النبى ﷺ او سوال وجّه اليه فنزلت الاٰية او الاٰيات من الله تعالىٰ ببيان ما يتصل بتلك الحادثة او بجواب هذا السوال.۱۱	سبب نزول وہ ہے جس کے بارے میں آیت یا آیات نازل ہوئیں، یا اس کے ایامِ وقوع میں اس کے حکم کو ظاہر کیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی واقعہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پیش آیا یا کوئی سوال آپ سے کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت یا آیتیں نازل ہوئیں جن میں اس واقعہ کا بیان ہے، یا اس سوال کا جواب ہے۔

حدیث قرآن کی شارح ہے، اس کے مجمل کی تفصیل ہے، اس کے مطلق کی مقیّد ہے، اس کے عام کی مخصّص ہے، اس کے مبہم کی مبیّن ہے، اس کے اسرار کی مظہر ہے۔۱۲

یحییٰ بن کثیرؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے:

السنة قاضية على الكتاب، وليس الكتاب قاضياً على السنة۔[۱۳]

سنت کتاب کا فیصلہ کرنے والی ہے، کتاب سنت کا فیصلہ کرنے والی نہیں ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ جملہ قرآن کے مقام و مرتبہ کو کم کرتا اور سنت کے مقابلے میں اس کی حیثیت گھٹاتا ہے، اس لیے یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے ذریعے قرآن و سنت کے باہمی تعلق کے ایک پہلو کو واضح کیا گیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

> ''اصل یہ ہے کہ قرآن سنت کا محتاج ہے، کیوں کہ سنت قرآن کی مبیّن ہے۔ اس کے مجملات کی تفصیل کرنے والی ہے، قرآن گویا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے جسے ضرورت ہے کہ کوئی اسے آشکارا کرے، سنت اسے آشکارا کرتی ہے، یہی مطلب ہے اس بات کا کہ ''سنت کتاب کا فیصلہ کرنے والی ہے قرآن، سنت کا 'مبیّـن' نہیں ہے اور اس کا فیصلہ کرنے والا بھی نہیں۔ کیوں کہ وہ بذاتِ خود 'مبیّن' ہے، وہ قرآن کی طرح اعجاز و ایجاز کی حد تک نہیں پہنچی ہے، کیوں کہ سنت قرآن کی شرح ہے اور شرح کی شان یہ ہے کہ وہ مشروح سے زیادہ واضح اور صاف ہو''۔[۱۴]

حدیث کے ذریعے قرآن کی وضاحت کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) سورۂ انفال میں ہے:

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللّٰهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ (الانفال:۷)

اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمھیں ملے گی، تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آجائے اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے کلمات کے ذریعہ حق کا حق ہونا عملاً ثابت کردے اور ان کافروں کی بنیاد کو قطع کردے۔

وہ دو جماعتیں کون تھیں جن میں سے ایک کا وعدہ مسلمانوں سے کیا گیا تھا، اور جس جماعت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ کون تھی؟ اور یہ وعدہ کہاں کیا گیا تھا؟ احادیث و آثار کی طرف رجوع کرنے سے ہمیں ان سوالوں کا جواب مل جاتا ہے۔

(۲) سورۂ توبہ میں ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئاً وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِيْنَ۔ (التوبۃ: ۲۵)

لڑائی کی بہت سی جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب کہ تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہوگیا تھا، پھر وہ کثرت تمھارے لیے کچھ کارآمد نہ ہوئی اور تم پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی، پھر آخر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس آیت کو بھی ہمیں احادیث و آثار کی روشنی میں سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(۳) سورۂ عبس میں ہے:

عَبَسَ وَتَوَلَّى. أَن جَاءَهُ الْأَعْمَى. وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى. أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَى. أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَى. فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّى۔ (عبس: ۱-۶)

وہ چیں بہ جبیں ہوگئے اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا، اور آپ کو کیا خبر، شاید وہ آپ کی تعلیم سے پورے طور پر سنور جاتا، یا کسی خاص امر میں نصیحت قبول کرتا تو اسے وہ نصیحت فائدہ پہنچاتی، تو جو شخص دین سے بے پروائی کرتا ہے آپ اسی کی فکر میں پڑتے ہیں۔

یہ آنے والے نابینا کون تھے؟ اور وہ کون لوگ تھے جن کی طرف رسول اللہ ﷺ ان کے آنے کے وقت متوجہ تھے؟ ان سوالات کے جوابات کے لیے ہمیں احادیث و آثار کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

(۴) سورۂ احزاب میں ہے:

وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا. وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا۔ (الاحزاب:۲۶-۲۷)

اور جن اہلِ کتاب نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا۔ بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کرلیا۔ اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا۔

اس آیت کریمہ میں جن اہل کتاب کا تذکرہ ہے وہ کون لوگ تھے؟ ان کی زمین و جائداد کہاں تھی؟ اور وہ زمین جہاں مسلمانوں کے قدم نہیں پہنچے تھے کون سی تھی؟ روایات سے صرفِ نظر کر کے یہ باتیں نہیں جانی جاسکتیں۔

فہم قرآن کے لیے حدیث کی ضرورت کہاں کہاں ہے؟

گذشتہ تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ قرآن فہمی کے لیے حدیث سے استفادہ ضروری ہے۔ درج ذیل صورتوں میں تدریسِ قرآن کے وقت حدیث سے استفادہ ضروی ہے:

۱- غرائبِ قرآن اور مشکلاتِ قرآن کی مراد جاننے کے لیے: شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شرحِ غریب میں احسنِ طرق وہ ہے جو ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ابن ابی طلحہؒ کے طریق سے، پھر ضحاکؒ کے طریق سے، پھر نافع بن ازرق کے طریق سے مروی ہے۔ [۱۵] شاہ صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ جو غرائبِ قرآن تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ اور تذکیر بالموت و ما بعدہ سے متعلق ہیں، وہ احادیثِ کریمہ میں مزید اہتمام و تفصیل کے ساتھ بیان کردیے گئے ہیں۔ [۱۶]

۲- شانِ نزول سے واقف ہونے کے لیے: مثلاً وہ آیاتِ کریمہ جن میں کسی واقعہ، کسی سوال کا جواب، یا کسی تنبیہ وغیرہ کا ذکر ہو۔ اس قسم کی چند آیتیں یہ ہیں:

سورۂ انفال، آیت ۵ تا ۱۱ میں غزوۂ بدر کا واقعہ، سورۂ آل عمران آیات ۱۵۲ تا

۱۵۵ اور ۱۶۵ تا ۱۶۸ میں غزوۂ احد کا واقعہ، سورۂ احزاب آیات ۹ تا ۲۵ میں غزوۂ خندق کا واقعہ، سورۂ فتح آیات ۱ تا ۱۰ و ۱۸ تا ۲۷ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ، سورۂ توبہ آیات ۷ تا ۲۴ اور ۳۸ تا ۴۲ میں فتحِ مکہ اور غزوۂ تبوک کا واقعہ، سورۂ احزاب، آیات ۳۶ و ۳۷ میں حضرت زینبؓ سے نکاح کا واقعہ، سورۂ نور آیات ۱۱ تا ۲۰ میں واقعۂ افک، سورۂ جن آیات ۱ تا ۱۹ میں جنات کے وفد کا رسول اللہ ﷺ کی تلاوت سننے کا ذکر اور سورۂ توبہ آیات ۱۰۷ تا ۱۱۰ میں مسجد ضرار کا قصہ وغیرہ۔

۳- اس تفسیر سے واقف ہونے کے لیے جو رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرامؓ سے منقول ہو، مثلاً آیاتِ کریمہ:

الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَلَمْ يَلْبِسُواْ إِيْمَانَهُم بِظُلْمٍ۔ (الانعام: ۸۲)	جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو 'ظلم' کے ساتھ مخلوط نہیں کیا۔

اس میں 'ظلم' کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے 'شرک' سے فرمائی اور استدلال میں آیتِ کریمہ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان: ۱۳) کی تلاوت فرمائی۔ [۱۷]

اور آیت کریمہ:

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتٰبَهُ بِيَمِيْنِهِ. فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَاباً يَسِيْراً۔ (الانشقاق: ۷-۸)	اور بہر حال جسے اس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔

اس میں 'حِسَاباً يَّسِيْراً' کی تفسیر 'عرض' سے کی۔ یعنی صرف حساب پیش ہو جائے گا، کچھ کھود کرید اور پوچھ تاچھ نہ ہوگی۔ [۱۸]

۴- ناسخ و منسوخ کی بحث سمجھنے کے لیے: یہ علوم قرآن کی ایک اہم بحث ہے۔ اس کی دو صورتوں کا براہِ راست تعلق حدیث سے ہے، **نسخ القراٰن بالسنة، نسخ السنة بالقراٰن**۔ [۱۹]

نسخ القرأن بالسنة کا کیا مطلب ہے؟ یہ ایک طویل بحث ہے، جس کا یہاں موقع نہیں ہے، اس کے لیے علوم القرآن کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

ایک آیت کی کئی تاویلات؟

کچھ حضرات کو احادیث و آثار سے استدلال کرنے میں اس وقت اشکال ہوجاتا ہے جب ان کے سامنے ایک آیت کی کئی کئی تاویلات سامنے آتی ہیں۔ حالاں کہ یہ اشکال درست نہیں ہے۔ اگر کوئی لفظ دو مشترک معنوں میں ہوگا تو ہر معنیٰ کے اعتبار سے اس کی الگ الگ تاویل ہوجانا بدیہی امر ہے۔ یہ ذرا بھی قابل تعجب نہیں۔ عقلی اعتبار سے بھی اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے:

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلاثَةَ قُرُوٓءٍ۔(البقرۃ: ۲۲۸)	مطلقہ عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو تین 'قروء'۔

یہاں 'قروء' سے کیا مراد ہے؟ 'قروء' دو معنوں میں مشترک ہے اور دونوں متضاد معنیٰ ہیں۔ ایک 'حیض'، دوسرے 'طہر'۔ اگر کوئی مجتہد وفقیہ، دونوں میں سے کسی ایک کو، اپنے تلاش کردہ آثار وقرائن کی روشنی میں، اور دوسرا، دوسرے معنیٰ کو، اپنی تحقیق وجستجو کے نتیجے میں، متعین ومشخّص کرے تو اس کو موجب طعن کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اور یہ چیز مورد الزام کیسے ہوجائے گی کہ ایک ہی آیت سے ایک نے 'حیض' اور دوسرے نے 'طہر' مراد لے لیا، جب کہ آیت خود ہی دونوں معنوں پر مشتمل ہے، لہٰذا آیتِ کریمہ میں نہ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض ہوسکتا کہ انھوں نے لفظ 'قروء' سے حیض کیوں مراد لے لیا؟ نہ امام شافعیؒ پر کہ انھوں نے 'طہر' کیوں مراد لے لیا؟ جو لفظ کئی معنوں میں مشترک ہوگا، آیت کریمہ کی مراد کو واضح اور متعین کرنے کے لیے تاویل وتوجیہ کے ذریعہ اس کا ایک معنیٰ متعین کرنا ہوگا، نہ کہ من مانے طریقہ پر دونوں معانی بتا کر آیت پر عمل کرنے کے سلسلے میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ بھلا یہ چیز قابلِ اشکال واعتراض کیسے ہوسکتی ہے؟! جب کہ خود نبی کریم ﷺ سے یہ ارشاد گرامی منقول ہے:

انزل القرآن علیٰ سبعة أحرف، لکل اٰیة منها ظهر وبطن، ولکل حدّ مطلع۔[۲۰]	قرآن، سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، ان میں سے ہر آیت کے لیے ایک ظاہر ہے، ایک باطن ہے اور ہر حد کے خبردار ہونے کی جگہ ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

''حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ ان (حروفِ سبعہ) میں سے ہر ایک کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ اور ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کی ایک جائے اطلاع ہے، لہٰذا یہ جاننا مناسب ہے کہ ان علوم خمسہ کا ظاہر کلام الٰہی کا مدلول اور اسی کا منطوق ہے اور باطن ہے۔ الاء اللہ کی تذکیر میں اللہ کی نعمتوں میں خوب غور کرنا اور حق سبحانہ و تعالیٰ کا دل میں دھیان رکھنا اور ایامّ اللہ کی تذکیر میں ان قصوں سے مدح وذم اور ثواب و عقاب کی علّت پہچاننا اور ان سے نصیحت حاصل کرنا اور جنت و جہنم کی تذکیر میں دوزخ کا خوف اور جنت کی امید ظاہر کرنا اور ان امور کو ایسا بنانا کہ گویا ان کو دیکھ رہا ہے۔ اور آیاتِ احکام میں کلام الٰہی کے مضامین اور مفاہیم سے مخفی احکام کا استنباط کرنا ہے اور فرق باطلہ کے مباحث میں ان قباحتوں کی بنیاد پہچاننا اور ان جیسی قباحتوں کو ان کے ساتھ ملانا ہے اور ظاہر کی جائے اطلاع کا مطلب عربی زبان کو جاننا اور ان آثار کو پہچاننا ہے جو علم تفسیر سے تعلق رکھتے ہیں اور باطن کی جائے اطلاع سے مراد ذہن کا عمدہ اور فہم کا درست ہونا ہے نورِ باطن اور دل کے سکون کے ساتھ''۔[۲۱]

مذکورہ بالا امور کے پیش نظر کسی آیت کی کئی تاویلات ہونا موجبِ حیرت یا باعث اشکال نہیں اور نہ ایسا ہونا خلاف عقل کہا جائے گا؟:

ایک آیت کی کئی شان نزول؟

بعض حضرات کو اس میں بھی اشکال ہوتا ہے کہ ایک آیت کی کئی کئی شانِ نزول احادیث و آثار سے ثابت ہوتی ہیں تو آخر کس شان نزول کو لیا جائے اور احادیث و آثار سے کیسے استدلال کیا جائے؟

اس کا جواب ڈاکٹر صبحی صالح نے اپنی کتاب 'علوم القرآن' میں تفصیل سے دیا ہے اور اس کے سارے وجوہ اور طریقۂ تطبیق و تاویل و ترجیح کو بھی بیان کر دیا ہے،[۲۲] لیکن

یہاں ہم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی گفتگو کو پوری تفصیل سے نقل کریں گے جو اس موضوع پر کافی وشافی ہے:

''فن تفسیر کے دشوار مقامات میں سے ایک اسبابِ نزول کا پہچاننا بھی ہے اور دشواری کی وجہ متقدمین ومتاخرین کی اصطلاحوں کا مختلف ہونا ہے۔

جو بات صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے کلام کا جائزہ لینے سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات 'نزلت فی کذا' کوصرف اس واقعہ کے بیان کے لیے نہیں لیتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پیش آیا، بلکہ بسا اوقات وہ حضرات، آیت جن واقعات پر صادق آتی، اُن میں سے بعض واقعات کو ذکر کرتے، چاہے وہ واقعہ آں حضرت ﷺ کے زمانے میں پیش آیا ہو، یا اس کے بعد پیش آیا ہو، پھر کہتے تھے **نزلت فی کذا** (یہ آیت فلاں واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی)۔ اس صورت میں آیت میں ذکر کردہ تمام قیود کا منطبق ہونا ضروری نہیں، بلکہ صرف اصل حکم کا منطبق ہونا کافی ہوگا۔

کبھی صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام ایسا مسئلہ ذکر کرتے ہیں جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا، یا ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں پیش آیا ہو اور آپ نے اس مسئلہ یا واقعہ کا حکم آیت سے مستنبط فرمایا ہو اور اس آیت کو صحابۂ کرام کے سامنے اس سلسلے میں تلاوت فرمایا ہو تو وہ لوگ اس وقت **نزلت کذا** کہتے ہیں، اور بسا اوقات ان صورتوں میں وہ کہتے ہیں کہ **فانزل اللہ قولہ کذا** (پس اللہ تعالیٰ نے اپنا فلاں ارشاد نازل فرمایا) یا **فنزلت** (پس فلاں آیت نازل ہوئی)۔

یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آں حضرت ﷺ کا اس حکم کو آیت سے مستنبط کرنا اور اس آیت کا اس وقت آپ کے قلب مبارک میں ڈالا جانا بھی وحی اور نفث فی الروع کی ایک قسم ہے، اس لیے **فانزلت** کہا جا سکتا ہے، اور اگر کوئی اس کو تکرارِ نزول سے تعبیر کرے تو اس کے لیے بھی گنجائش ہے۔

محدثین قرآن کریم کی آیتوں کے تحت بہت سی چیزیں ذکر کرتے ہیں۔ وہ چیزیں حقیقت میں اسبابِ نزول کے قبیل سے نہیں ہیں۔ مثلاً صحابہ کرام کا اپنے علمی مباحثوں میں

کسی آیت سے استدلال کرنا یا ان کا اس آیت کو نظیر میں پیش کرنا، یا آں حضرت ﷺ کا کسی آیت کو اپنے ارشاد گرامی میں استدلال کی غرض سے تلاوت کرنا، یا کسی ایسی حدیث کو نقل کرنا بنیادی مقصد میں، جو آیت کے موافق ہو، یا نزول کی جگہ کی تعیین کرنا، یا ان لوگوں کے ناموں کی تعیین کرنا جن کا آیت میں مبہم طریقہ پر تذکرہ کیا گیا ہے، یا قرآن مجید کے کسی کلمہ کے تلفظ کا طریقہ بیان کرنا یا قرآن پاک کی سورتوں اور آیتوں کی فضیلت بیان کرنا، یا قرآن مجید کے احکام میں سے کسی حکم پر رسول اللہ ﷺ کے عمل کا طریقہ بیان کرنا۔ پس ان میں سے کوئی چیز درحقیقت اسبابِ نزول میں سے نہیں ہے''۔[۲۳]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''پس اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ شانِ نزول کی اس قسم میں اجتہاد کو دخل ہے اور متعدد قصوں کی یہاں گنجائش ہے۔ جو شخص اس نکتے کو یاد رکھے گا وہ معمولی غور و فکر سے اسباب نزول کے اختلاف کو حل کر لے گا''۔[۲۴]

خلاصہ یہ کہ تفسیر کی کتابوں میں ایک ایک آیت کے تحت جو کئی کئی روایات لکھی ہوتی ہیں ان میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔ وہ ساری روایات شان زول سے متعلق نہیں ہوتیں۔ غور و خوض کے بعد پتا چل جاتا ہے کہ کون روایت اصل شانِ نزول ہے اور کون محض اس کا مصداق ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد تقی عثانی نے اپنی کتاب 'علوم القرآن' میں 'سبب نزول اور اختلافِ روایات' کے عنوان سے بڑی اچھی بحث کی ہے اور اس الجھن کو بڑے محققانہ انداز میں دور کیا ہے جو ایک ہی آیت کے سبب نزول میں کئی کئی مختلف روایتوں کے ملنے سے پیش آتی ہے۔[۲۵]

چند مشہور قرآنی مباحث میں حدیث سے استفادہ کی مثالیں

۱- قرآن مجید کا جب ہم پہلا ورق کھولتے ہیں تو ہماری نگاہ سب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر پڑتی ہے، اور اس کے بعد متصلاً سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ فاتحہ ختم ہونے پر سورۂ بقرہ شروع ہوتی ہے، تو اس سے پہلے بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے، اسی طرح ہر سورہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی ہوئی ہے۔[۲۶]

تدریسِ قرآن سے وابستہ شخص جب یہ دیکھتا ہے تو اتنی بات فوراً اس کی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جو سورتوں کے شروع میں لکھی ہے وہ قرآن کا جزء تو یقیناً ہے، کیوں کہ ما بین الدفتین سوائے قرآن کے اور کوئی چیز نہیں، لیکن کیا ہر سورت کے شروع میں لکھے ہونے سے وہ ہر سورت کا بھی جزء ہے۔؟ ۲۷

یہ مشکل اگر ہم غور کریں تو پہلے مرحلے پر ہی حل ہو جاتی ہے، کیوں کہ قرآن مجید کے پہلے صفحہ کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اس کے معاً بعد سورۂ فاتحہ سے ہوا ہے اور سورۂ فاتحہ سے متعلق یہ حدیث نبوی موجود ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

قال اللہ تعالیٰ قسّمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل، فاذا قال العبد الحمد للہ رب العالمین قال اللہ تعالیٰ حمدنی عبدی، و اذا قال الرحمن الرحیم قال اللہ تعالیٰ اثنی علیّ عبدی، و اذا قال مالک یوم الدین قال مجّدنی عبدی، و اذا قال ایاک نعبد و ایاک نستعین قال ھٰذا بینی و بین عبدی ولعبدی ما سأل، فاذا قال اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین قال ھذا لعبدی ولعبدی ما سأل۔ ۲۸

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے سورۂ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ مانگے۔ جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی، پھر جب وہ کہتا ہے الرحمٰن الرحیم تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی، اور جب بندہ کہتا ہے مالک یوم الدین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ اور جب بندہ ایاک نعبد و ایاک نستعین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا۔ جب بندہ اہدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہتا ہے، تو اللہ فرماتا ہے یہ میرے بندہ کے لیے ہے: اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا۔

اس حدیث میں سورۂ فاتحہ کی ایک ایک آیت کا تذکرہ ہے اور آغاز الحمد للہ رب العالمین سے کیا گیا ہے۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت الحمد للہ رب العالمین ہے، نہ کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ورنہ آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا۔ گویا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جو سورۂ فاتحہ کے شروع میں ہے وہ سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں ہے، بلکہ اس کا کچھ اور مقصد ہے۔ وہ مقصد ایک دوسری حدیث سے واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

كان رسول الله ﷺ لايعرف فصل السورة حتى ينزل عليه بسم الله الرحمن الرحيم ۔[29]	رسول اللہ ﷺ سورتوں کا فصل نہیں جانتے تھے، یہاں تک کہ آپ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی تھی۔

گویا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مقصد سورتوں کے درمیان فصل کو ظاہر کرنا ہے کہ ایک سورہ ختم ہوگئی، اب دوسری شروع ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سورتوں کا جزء قرار دے دیا جائے تو جہری نمازوں میں اگر کوئی سورہ شروع سے پڑھنا ہو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بھی جہراً پڑھنا پڑے گا، ورنہ اس کی پہلی آیت چھوٹ جائے گی۔ مثلاً فاتحہ پڑھتے وقت الحمد للہ رب العالمین سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھنا ہوگی، تاکہ سورۂ فاتحہ کی کوئی آیت جہراً پڑھنے سے چھوٹ نہ جائے۔

۲-سورۂ مزمل میں ہے:

فَاقْرَؤُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۔ (المزمّل: ۲۰)	پس پڑھو جو آسان ہو قرآن سے۔

یہ آیتِ کریمہ نماز میں قرآن پڑھنے سے متعلق ہے، گویا نماز پڑھنے والوں کو اجازت دی گئی ہے کہ انھیں قرآن کا جو حصہ پڑھنے میں آسان لگے پڑھ دیں، نہ کہ کوئی مخصوص سورہ، جس کا پڑھنا ضروری اور فرض ہو۔ یعنی مطلق قرأت قرآن فرض ہے، چنانچہ خود حدیث میں بھی اسی طرح کے الفاظ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی حضرت خلادؓ بن رافع کو نماز کا طریقہ سکھاتے ہوئے فرمایا تھا:

اذاقمت الیٰ الصلوٰۃ فاسبغ الوضوء	جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اچھی طرح وضو کرو،
ثم استقبل القبلة فکبّر ثم اقرء بما	پھر قبلہ کی طرف رخ کر کے اللہ اکبر کہو، پھر
تیسّر معک من القراٰن ۔۳۰	قرآن میں سے جو تم سے ہو سکے، پڑھو۔

قرآن کی آیت اور حدیث دونوں میں 'ما' آیا ہے، جو کہ عام ہے، لہٰذا اس عموم کو چھوڑ کر کسی مخصوص سورہ کو فرض قرار دینا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن کچھ احادیث اس مضمون کی وارد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے، ورنہ نماز نہ ہوگی، مثلاً:

لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحة الکتاب. ۳۱ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بأم القراٰن فصاعداً. ۳۲ لاصلوٰۃ الا بقراءۃ فاتحة الکتاب فما زاد. ۳۳ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بالحمد و سورة فی فریضة او غیرها. ۳۴ امرنا ان نقرء بفاتحة الکتاب وما تیسّر۔۳۵ وغیرہ۔

اب سوائے تاویل وتوجیہ کے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ چناں چہ یہ توجیہ کی گئی ہے کہ مطلق قرأتِ قرآن فرض ہے اور مذکورہ بالا احادیث کی وجہ سے سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔

حواشی ومراجع

۱ ابن حجر عسقلانی، نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر، طبع دیو بند، ص ۷۵

۲ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب أنزل القرأن علی سبعۃ أحرف، ۴۹۹۱، ۳۲۱۹؛ صحیح مسلم: ۸۱۹

۳ حوالہ بالا

۴ صبحی صالح، علوم القرآن، اردو ترجمہ غلام احمد حریری، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۴-۱۵۲

۵ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب مدّ القراءۃ، ۵۰۴۶

۶ شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب العمری التبریزی، مشکٰوۃ المصابیح، بحوالہ بیہقی، ۱/۱۹۱، کتاب فضائل القرآن

۷ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب 'وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الأبیض من الخیط الاسود من الفجر' ۴۵۱۰، ۱۹۱۶، صحیح مسلم: ۱۰۹۰

۸ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الصرف وبیع الذھب بالورق نقدا، ۱۵۸۴

۹۔ شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، مکتبہ حجاز دیو بند، ص ۱۶-۱۷
۱۰۔ مشکوٰۃ المصابیح، ۳۱/۱، کتاب الایمان فی الاعتصام بالکتاب والسنۃ، بہ حوالہ بیہقی۔
۱۱۔ الزرقانی، مناھل العرفان، دار احیاء الکتب العربیۃ، القاہرۃ، ۹۹/۱
۱۲۔ حوالہ بالا، ۲۹۲/۱
۱۳۔ حوالہ بالا ۱۴۔ حوالہ بالا، ۲۹۲/۱-۲۹۳
۱۵۔ الفوز الکبیر، ص ۴۹-۵۰ ۱۶۔ حوالہ بالا، ص ۱۱۷-۱۱۸
۱۷۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ظلم دون ظلم، ۳۲، صحیح مسلم: ۱۲۴
۱۸۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من سمع شیئا فراجع حتی یعرفہ، ۱۰۳، صحیح مسلم: ۲۸۷۶
۱۹۔ مناھل العرفان، ۱۳۳/۲-۱۴۲
۲۰۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، بحوالہ بیہقی، ۳۵/۱
۲۱۔ الفوز الکبیر، ص ۱۱۸-۱۱۹ ۲۲۔ علوم القرآن، ص ۲۰۲، ۲۱۲
۲۳۔ الفوز الکبیر، ص ۶۰-۶۱ ۲۴۔ حوالہ بالا، ص ۱۰۶-۱۰۷
۲۵۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، علوم القرآن، کتب خانہ نعیمیہ دیو بند، سنہ طبع درج نہیں، ص ۶۷-۹۵
۲۶۔ سوائے سورۂ براءت (سورۂ توبہ) کے۔ اور اس کی ایک خاص وجہ ہے جس کا تذکرہ حضرت عثمانؓ نے کیا ہے، دیکھیے مشکوٰۃ، ۱۹۴/۱، بہ حوالہ ترمذی وابوداؤد
۲۷۔ واضح رہے کہ یہ اس بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ذکر نہیں ہے، جو سورۂ نمل آیت ۳۰ میں ہے، کیوں کہ وہ اس سورت کا جزء ہے۔
۲۸۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، ۳۹۵
۲۹۔ مشکوٰۃ المصابیح، ۱۹۳/۱، کتاب فضائل القرآن، بہ حوالہ ترمذی، ابوداؤد، احمد۔
۳۰۔ صحیح بخاری، کتاب الأذان، باب امر النبیؐ الذی لا یتم رکوعہ بالاعادۃ، ۶۲۵۱، صحیح مسلم: ۳۹۷
۳۱۔ صحیح بخاری، کتاب الأذان، باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم فی الصلوات کلھا فی الحضر والسفر وما یجہر فیہا وما یخافت، ۷۵۶
۳۲۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، ۳۹۴
۳۳۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ بفاتحۃ الکتاب، ۸۲۰
۳۴۔ سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی تحریم الصلاۃ وتحلیلہا، ۲۳۸
۳۵۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، ۸۱۸

☆☆☆